هکذاظهر جیل صلاح الدین و هکذا عادت القدس، عہد ایوبی کی نسل نو اور القدس کی بازیابی (سلطان صلاح الدین ایوبی کی کامیابی میں صوفیہ کا کردار)

الکیلانی، ماجد عرسان ڈاکٹر، (مصنف)، صاحبزادہ محمد عبدالرسول (مترجم)، اردو سائنس بورڈ، لاہور (ناشر)، ۲۰۰۴ء (اشاعت)، ۲۷۵ روپے (قیمت)، ۳۱۹ صفحات (ضخامت)۔

حافظ محمد بلال اعجاز*

دنیا کے مختلف خطوں میں توسیع واشاعت اسلام اور دنیائے اسلام کو درپیش خطرات سے حفاظت وصیانت کے حوالے سے سلاطینِ اسلام کے پہلو بہ پہلو علماء وفقہاء اور صوفیائے عظام کا کردار کلیدی رہا ہے۔ اس حوالے سے صوفیائے کرام نے اپنے ایثار، بے نفسی اور اخلاص سے معاشرے کو اپنی دینی نہج اور روح پر قائم اور رواں دواں رکھنے کے لیے انتھک کوششیں کیں اور معاشرے کے سدھار میں اپنا کردار ادا کیا۔

اس تناظر میں اگر دولتِ اسلامیہ عباسیہ کے انتہائی نازک ترین عہد میں جہاں ایک طرف باطنی واسماعیلی حکومتیں اہلسنت والجماعت کے اجماعی موقف ومنہج کے خلاف فکری وسیاسی طور پر برسر پیکار تھیں تو دوسری طرف صلیبیوں کے لشکر اس طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔ صوفیائے کرامؒ کی تجدیدی واصلاحی خدمات اور ان کے قائم کردہ مراکز ''رباط'' ہی تھے جو ایک طرف علوم دینیہ کی تحصیل اور زہد وریاضت کے مراکز تھے تو دوسری طرف یہی ''رباط'' مسلم خطوں اور آبادیوں کے تحفظ کے مراکز اور چھاؤنیوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ اس طرح تصوف وجہاد کے باہمی ربط و اتصال سے ملت اسلامیہ کو درپیش اندرونی وبیرونی خطرات کا مداوا ہوتا رہا۔

ڈاکٹر ماجد عرسان الکیلانی کی درج بالا عنوان کی حامل یہ کتاب تاریخ اسلام کے انہی گوشوں کی تفصیل فراہم کرتی ہے۔ جس میں معاشرہ اپنے اندرونی انحرافات اور تضادات کے باوجود صوفیائے کرام کے اشتراک وتعاون کے نتیجے میں ان خطرات پر قابو پاسکا اور اپنے ''رباط'' کے ہمہ گیر وہمہ پہلو تربیتی نظام کے نتیجے میں ایک ایسی نسل نو وجود میں لانے میں کامیاب ہوسکا جس نے سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں القدس کو فتح کیا اور اس کی بازیابی کا سبب بنے۔

اردو سائنس بورڈ کے زیر اہتمام اس مؤقر کتاب کا اردو ترجمہ استاذ تاریخ پروفیسر صاحبزادہ محمد عبدالرسول صاحب نے کیا ہے جو اسی موضوع پر ایک وقیع کتاب بعنوان ''تاریخ مشائخ نقشبندیہ'' کے مؤلف بھی ہیں۔

---

* اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر، شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب لاہور

گرانقدر مباحث ومضامین کی حامل کتاب کے مندرجات کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل عناوین سامنے آتے ہیں:

۱- صلیبی حملوں سے پہلے معاشرے کی فکری صورتحال

۲- اسلامی معاشرہ میں فکری انتشار کی صورتحال

۳- تحریک تجدید واصلاح کا پہلا مرحلہ (امام غزالیؒ کا کردار واثرات)

۴- تحریک اصلاح وتجدید کا پھیلاؤ (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور مدارسِ اصلاح)

۵- تحریک اصلاح وتجدید کے عمومی اثرات

الف۔ مدارس اصلاح اور حکومت فرنگیہ میں تعاون ب۔ علماء اور جہاد

ج۔ اسلامی وحدت اور القدس کی بازیابی

۶- تاریخی قوانین

امت مسلمہ پر جاری مغربی یورشوں اور فوج کشی نے مولف کتاب ہذا اور دیگر اہل دانش کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ اگر انہیں اپنے ملی وقومی تشخص کو محفوظ رکھنا ہے تو اس کے لیے انہیں اسوہ رسول اکرم ﷺ اور سلفِ صالحین کی منہج کی روشنی میں ہی اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کی تشکیل کرنی ہوگی جس کے نتیجے کے طور پر داخلی وخارجی مصائب و مشکلات سے نبٹنا آسان ہوجائے گا۔ اس حوالے سے مؤلف کتاب کے نزدیک انفرادی درستگی اور معاشرے کے اندر تبدیلی کا عمل ہی امت کی سیاسی واجتماعی درستگی کی بنیاد بنے گا۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ؛

''پہلا: ہر معاشرہ تین عناصر سے عبارت ہے یعنی افکار، اشخاص اور اشیاء..... معاشرہ اس وقت صحت وعافیت کے عروج پر ہوتا ہے، جب اشخاص اور اشیاء صحیح افکار کے گرد گھومتے ہوں، لیکن جب افکار واشیاء، اشخاص کے گرد گھومنے لگیں تو معاشرہ کو مرض لاحق ہوجاتا ہے اور معاشرہ اس وقت تباہی کی حالت کو پہنچ جاتا ہے جب افکار و اشخاص، اشیاء کے گرد گردش کرنے لگیں۔

دوسرا: انسانی عمل، قصد اور حرکت کا نام ہے۔ قصد، فکر اور ارادہ سے وجود میں آتا ہے۔ حرکت عملی مشقوں میں وجود میں آتی ہے۔ عمل کے یہ عناصر تین دائروں میں منظم ہوکر ایک دوسرے کو جنم دیتے ہیں۔ پہلا دائرہ فکری میدان میں شروع ہوتا ہے، اس کے بعد دوسرا دائرہ ارادہ کے میدان میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ تیسرا دائرہ انسانی جسم سے خارج ہونے والی عملی مشقوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس تصور کی بنا پر آگے بڑھیں تو فکر کے ذریعے اجتماعی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جو کہ مقاصد کو جنم دیتی ہیں۔ پھر

ذاتی رجحانات سامنے آتے ہیں جو ارادوں کو رخ عطا کرتے ہیں یہاں تک کہ عملی مشقوں پر معاملہ ختم ہوتا ہے جن سے زندگی کے مختلف میدانوں میں کارنامے سامنے آتے ہیں۔'' (ص:۲۶۔۲۷)

مؤلف کے نزدیک کسی بھی امت کی اجتماعی خصوصیات کی حفاظت و بقا ہی اس کی حیات کی ضامن ہوتی ہے اور اجتماعی خصوصیات کے ضمن میں دو پہلو انتہائی اہم ہیں؛

۱- ارادہ میں اخلاص

۲- فکر و عمل میں درستگی

اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ؛

'' قرآن کریم جب اجتماعی خصوصیات میں تبدیلی کا طریقہ بیان کرتا ہے تو وہ انسانی عمل کو اسی ترتیب سے پیش کرتا ہے جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول، مثبت اجتماعی تبدیلی کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

''اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدلتی۔''

اور منفی اجتماعی تبدیلی کی طرف اللہ تعالیٰ کا قول یوں اشارہ کرتا ہے:

''یہ اس لیے ہوا کہ اللہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب وہ قوم خود اپنے اوصاف کو بدل نہیں دیتی۔''

اسی طرح اجتماعی خصوصیات کے بارے میں فلسفہ کا یہ تصور حدیث نبوی ﷺ سے مطابقت رکھتا ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

(انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو، وہ دل ہے)

یہاں دل کی طرف اشارہ کا سبب یہ ہے کہ دل میں دو قوتیں ہیں، قوتِ فکر اور قوتِ ارادہ۔ یہ دو قوتیں مل کر عمل کے دو دائروں کو جنم دیتی ہیں: دائرۂ فکر اور دائرہ ارادہ- پھر تیسرا دائرہ وجود میں آتا ہے یعنی خارجی دنیا میں اعضاء کے ذریعے عملی کارنامہ۔

قرآن کریم اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تبدیلی اس وقت تک بارآور نہیں ہوتی جب تک خود قوانین تغیر اس کی رہنمائی نہ کریں۔ ان قوانین میں سے:

پہلا قانون: تبدیلی، نفوس کے اجزائے ترکیبی میں شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد اجتماعی، اقتصادی، سیاسی، عسکری، انتظامی، عدالتی اور خارجی زندگی کے جملہ میدانوں میں یہ تبدیلی آجاتی ہے۔ نفوس کے اجزائے ترکیبی کے معنی بہت وسیع ہیں۔ ان میں افکار، اقدار، ثقافت، رجحانات، عادات اور روایات شامل ہیں۔ اسی طرح

پیدائش، زندگی اور قسمت سے لیے گئے تصورات، بقائے انسانی کی ضروریات، یعنی نکاح، غذا، لباس، مکان، امن، احترام، عدل اور احسان بھی ان کا حصہ ہیں۔

دوسرا قانون: اچھی یا بری تبدیلی اس وقت تک واقع نہیں ہوتی جب تک پوری قوم اس پر کمر بستہ نہ ہو، افراد کی تبدیلی صرف ان کی ذات تک ہوتی ہے۔ معاشرتی تبدیلی قوم کے سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور عسکری احوال سے منعکس ہوتی ہے۔

تیسرا قانون: تعمیری اور بارآور تبدیلی اس وقت آتی ہے جب قوم اپنے اندر کی تبدیلی کا آغاز کرتی ہے۔ اگر یہ تعلیمی وفکری تبدیلی اچھی ہوگی تو اس کے بعد اقتصاد، سیاست، فوج اور اجتماع وغیرہ کے میدانوں میں آنے والی تبدیلی بارآور ہوگی۔

اس تبدیلی کی نوعیت اور اس کے قوانین کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو شرطوں کو ذہن میں رکھا جائے۔ وہ یہ ہیں:

اجتماعی خصوصیات کو فروغ دینے والے طرزِ عمل کا مکمل ادراک اور اس کی تفصیل وترکیب پر پوری گرفت۔

جب اجتماعی خصوصیات کے عناصر منتشر ہوتے ہیں اور تاریخی ورثہ کے سفر میں سست روی آجاتی ہے تو تاریخی محقق کو چاہیے کہ وہ ان خصوصیات کے عمل کا اطلاق انسانی طرزِ عمل اور قوانینِ تغیر پر کرے۔

حالات اور تاریخی واقعات کی حکمتِ عملی سے حاصل ہونے والی بحث کے ذریعے فلسفۂ تاریخ ونتائج کی طرف لے جاتا ہے۔

پہلا نتیجہ: تاریخ اسلام میں قوت ومدافعت کے ادوار اس وقت وجود میں آئے جب یہ دو عناصر آپس میں مل گئے یعنی ارادہ میں اخلاص اور فکر وعمل میں درستی۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں غائب ہوگئے یا ایک نے دوسرے کو چھوڑ دیا تو جدوجہد اور قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔

دوسرا نتیجہ: تمام تاریخ، اسلامی اور غیر اسلامی، اس بات کی شاہد ہے کہ جب اجتماعی تعلقات ''مشترک افکار'' کی بنیاد پر قائم ہوں جنہیں امت نے اختیار کر رکھا ہے اور جن کی بنا پر وہ زندہ ہے تو معاشرہ کا ہر فرد محترم بن جاتا ہے (خواہ زندہ ہو یا مردہ) جب بھی اس کی رائے دوسروں سے مختلف ہو، معاشرہ کی خارجی سطح پر تنازعہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر جب تعلقات، ایک فرد، قبیلہ یا فرقہ کی وفاداری اور اشخاص واشیاء کے گرد گھومنے کی غرض سے تشکیل پائیں تو انسان، سوسائٹی کے اندر اور باہر ارزاں ترین چیز بن جاتا ہے اور تنازعہ معاشرہ کی داخلی سطح پر گردش کرنے لگتا ہے اور اسے مختلف فرقوں کی صورت میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے جو ایک دوسرے کا عذاب سہتے ہیں۔ پھر اس کمزوری کی بُو باہر سے حریصوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔'' (ص: ۲۷-۲۹)

انہی تاریخی اصولوں اور قوانین کی روشنی میں مؤلف جب خلافت عباسیہ کے مختلف عناصر اور طبقات اصلاح کے

جائزے کے ساتھ ساتھ ابتدائی صلیبی حملوں میں مسلمانوں کی ذلت وشکست کو دیکھتے ہیں تو انہیں اس پر سخت افسوس ہوتا ہے اور تڑپ کر لکھتے ہیں کہ؛

''ابتدائی صلیبی حملوں کے سامنے مسلمانوں کی شکستیں ان افکار، رجحانات، اقدار اور عادات کا نتیجہ تھیں جو مسلم معاشرہ کو داغدار کر رہی تھیں۔ سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی میدان میں جو مشقیں جاری تھیں، وہ اس رویہ کا آخری دائرہ تھیں جس کی ابتداء احساس سے ہوتی ہے، پھر عقل میں آتا ہے اور آخر میں خارجی اعضا میں پہنچ کر سیاسی، عسکری، اجتماعی، اور اقتصادی زندگی کے میدان میں انتہا کو پہنچتا ہے۔ یہ وہی ہے جس کا فیصلہ قرآن نے کیا ہے کہ معاشرتی خرابیاں نفس کے اجزائے ترکیب میں شروع ہوتی ہیں یعنی اعتقادات، اقدار، روایات اور عادات میں یہی خرابیاں عمل اور مشقوں کے منفی نتائج کا سبب بنتی ہیں:

''یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اس وقت تک نہیں بدلتا جب وہ قوم خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔'' (ص:۲۳)

اس حوالے سے مذہبی نزاع اور اس کے فکری، سیاسی و مذہبی اثرات، طبقہ صوفیہ کے انحرافی رجحانات کے پہلو بہ پہلو باطنی فکر کا چیلنج اور یونانی و ہندی فلاسفہ کی کتب کے تراجم و اشاعت ایسے عوامل جنہوں نے معاشرے کے صالح عناصر اور اس کی قوت و مزاحمت کو شکست و ریخت کا نشانہ بنانا شروع کیا جس کے نتیجے میں امت کا تصورِ وحدت متزلزل ہونا شروع ہوا اور کئی سیاسی اکائیاں ظاہر ہونے لگیں جو باہم متحارب اور برسرپیکار رہتی تھیں اور ۱۰۹۲ء میں سلطان ملک شاہ کی وفات کے بعد تو سلجوقی سلطنت پانچ ریاستوں میں تقسیم ہوگئی اور ان حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فاطمیین مصر نے بساسیری کی قیادت میں بغداد پر حملہ کر دیا اور عباسی خلیفہ کی معزولی کا اعلان کرنے کے بعد پورے ایک سال تک علماء وفقہائے اہلسنت والجماعت کا قتل عام کرتے رہے ان حالات کا نقشہ بیان کرتے ہوئے الاصفہانی لکھتے ہیں کہ؛

''اس دور میں بساسیری کے فتنہ کا خاتمہ ہوا۔ وہ ذی قعد، ۴۵۰ھ کو بغداد میں داخل ہوا اور ۱۶ ذی قعد ۴۵۱ھ کو یہاں سے نکلا۔ یہ ایک بُرا سال تھا، قریب تھا کہ اللہ کے نور کو بجھا دے۔ اس نے مصر سے داعی بلائے اور دارالامان میں خلیفہ کے مرکز میں منبر نہ رہا۔ بساسیری نے خلیفہ کے ایلچی رئیس الرؤسا ابومحمد بن مامون کو پھانسی پر لٹکا دیا اور قریش بن بدران عبدالرزاق ابونصر احمد بن علی کو قتل کر دیا۔ نظام اسلام میں خلل پڑ گیا، دارالسلام کو مرض لاحق ہوگیا، امام کی تنہائی طویل ہوگئی اور مخلوق کی مصیبت ہولناک ہوگئی۔'' (ص:۴۷)

صلیبی ان حالات کے منتظر تھے اور انہوں نے فلسطین اور سواحل شام پر قبضہ جمانے کے بعد فاطمیین مصر کے طلب کرنے پر ان کے ساتھ مل کر دولت اسلامیہ پر حملے شروع کر دیے اور فاطمیین کی طرف سے سلطان صلاح الدین کے قتل کے متعدد بار کوششیں ہوئیں جس میں وہ ناکام ہوتے رہے گویا سلطان کی حفاظت کا خدائی انتظام ہوتا رہا۔

تا آنکہ ''القدس'' کی فتح کے بعد آپ کا انتقال ہوا۔

فاطمیوں اور صلیبیوں ایسے بیرونی خطرات کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ کا اندرونی زوال بھی اپنی آخری حدوں پر تھا۔ اور ۱۰۹۸ء میں بیت المقدس کے صلیبیوں کے قبضے میں آنے کے بعد ستر ہزار مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ سلاجقہ باہم دست و گریباں تھے۔ انہی سخت ترین حالات میں امام محمد غزالی اور شیخ عبدالقادر جیلانی سامنے آئے جنہوں نے امت مسلمہ کو درپیش چیلنجوں کو بھانپتے ہوئے دو تدابیر اور ذرائع اختیار کیے۔

1۔ فکری ہتھیار اور عقیدہ کی اشاعت

2۔ ان اداروں کا قیام جو عملی زندگی میں اس عقیدہ کے حامل تھے (ص:۸۲) اس حوالے سے امام غزالی کی تجدید و اصلاحی خدمات کے نتیجے میں جہاں علماء و معلمین کی نئی نسل وجود میں آئی جنہوں نے ان مخالف فکری رجحانات جو باطنیہ اور فلاسفہ کے افکار کی صورت میں اسلامی فکر و عقیدہ میں داخل ہو چکے تھے جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکا۔ مؤلف کتاب لکھتے ہیں کہ؛

''ہمیں امام غزالی کی اس فکری جرأت کی قدر کرنی چاہیے خصوصاً جب ہم اس فکری خوف کو یاد کریں جو باطنیہ نے پھیلا رکھا تھا۔ وہ ہر مخالف کو قتل کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اس خوف کے نتیجہ میں سینکڑوں علماء و مشاہیر لڑکھڑا گئے۔'' (ص:۱۴۷)

اس تناظر میں امام غزالیؒ کی تجدیدی خدمات نے جو اثرات مرتب کیے مولف کے نزدیک وہ دو امور کی صورت میں ہیں؛

پہلا: ان کا طریق کار ''پسپائی اور پلٹنا'' کا اصول تھا۔ جو مختلف مذاہب اور اسلامی جماعتوں کے لیے مثال بن گیا۔ ان لوگوں نے مذہبی اختلافات و نزاعات کو خیر آباد کہہ کر اپنے ''نفس خاصہ'' کی طرف توجہ کی۔ جب ان کا تزکیۂ نفس ہو گیا تو وہ جدید معاشرہ کی طرف ''پلٹ'' آئے تاکہ وہ اس میں تعاون و محبت کی نیت سے حصہ لیں، نہ کہ فرقہ بازی اور دنیوی مفاد کے لیے اسے ارزاں فروخت کرنے لگیں۔ اسی طریقہ کی بدولت فقہاء اور صوفیہ میں ایسے گروہ پیدا ہو گئے جن کا قومی رجحان اس ایمان کی طرف تھا کہ مذہبی فرقوں کی کتب کے بجائے قرآن و سنت سے جدوجہد اور فیصلوں کی کامیابی حاصل کی جائے۔

دوسرا: وہ یہ کہ امام غزالی کی کوششوں سے منحرف فکر کے رجحانات مثلاً باطنیہ اور فلاسفہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور عوام میں ان کی منڈی میں مندی آ گئی، اور بعد میں وہ کساد اور سقوط کا شکار ہو گئے۔

یہ سب اس کے علاوہ ہے جس کا ذکر ہم نے محمد بن تومرت پر آپ کے اثرات کے ضمن میں کیا ہے جس نے عالمِ اسلام کے مغربی حصہ میں سلطنت موحدین کے قیام کو عملی صورت دی۔

یوں امام غزالیؒ نے تحریکِ اصلاح کو مہمیز لگائی جس کے حلقے آپ کے بعد جاری رہے، یہاں تک کہ وہ صلیبیوں

کی شکست اور مقدس مقامات کی بازیابی پر منتج ہوئے۔'' (ص:۱۵۵۔۱۵۸)

امام غزالی کے افکار کے نتیجے میں اصلاح وتجدید کے مدارس وجود میں آئے جن میں نمایاں ترین دائرہ ومرکز اصلاح ''مدرسہ قادریہ'' تھا جسے شیخ عبدالقادر جیلانی نے قائم کیا اور کامل نصف صدی تک اس کی قیادت کرتے ہوئے ایک ایسی نسل تیار کی جس نے آگے چل کر مدارسِ اصلاح ''رباط'' کا جال بچھا دیا اور حکومتِ زنگیہ وایوبیہ کے دست و بازو بن کر عالم اسلام کے دفاع کا حق ادا کیا اس حوالے سے مولف کتاب نے ان مدارس اصلاح کی ایک فہرست نقل کی ہے جس سے اس تجدیدی واصلاحی کام کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ؛

''تصوف اپنی گوشہ نشینی سے باہر آیا، جس حالت میں وہ اس سے پہلے تھا اور عالم اسلامی کو درپیش چیلنجوں کا سامنا کرنے میں حصہ لینے لگا۔سلطان نورالدین زنگی اور بغداد، حران، کوہ کار اور دمشق کے مدارسِ اصلاح کے شیوخ کے درمیان رابطے مستحکم ہوگئے۔ بعد ازاں ان مدارس نے نورالدین اور صلاح الدین کے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی۔ یہ تعاون جاری رہا، جبکہ دونوں سلطانوں نے ان مدارسِ زہد اور رباط پر غیر معمولی عنایات کیں، ان کی جدید شاخیں قائم کیں اور ان پر اوقاف وقف کیے۔دوسری طرف ان مدارس نے اپنی ذمہ داریاں اٹھائیں اور جہاد کی معنوی قیادت میں ان کا کردار نہایت فعال اور کامیاب رہا۔'' (ص:۲۱۹)

اس کے نتیجے میں ان مرکز یعنی ''رباط'' سے فارغ التحصیل افراد متحدہ ملت کی تشکیل نیز اسلامی مقاصد و ضروریات کو پیش نظر رکھ کر راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے تھے اور اس معنوی تیاری کے مرحلے سے گزر کر عسکری تیاری کا فریضہ بھی سرانجام دینے لگے اور ان اصحاب تجدید کے تجدیدی مرحلے میں سلطان صلاح الدین ایوبی سامنے آتے ہیں جنہوں نے اس تیاری کے مرحلے میں معنوی تبدیلی پیدا کی اور سلطان نورالدین زندگی کے ہاں خاص مقام بنا لیا، سلطان نورالدین اور صلاح الدین ایوبی نے حکومت کی طرف سے قائم کردہ مدارس میں ''مدرسہ قادریہ'' سے فارغ التحصیل افراد کو امورِ تربیت و امور مملکت سے متعلق مختلف ذمہ داریوں پر فائز کر دیا اور ان میں سے بعض سلطان کے مقربین اور مشیران میں داخل کیے گئے۔

اسی طرح مدارس اصلاح کا مملکت کے ساتھ تعاون نئی معاشرتی صف بندی کی تشکیل سے لے کر سیاسی وعسکری میدانوں تک پھیلا ہوا تھا۔شیخ عبدالقادر جیلانی کے ہاں سب سے زیادہ قربت کے حامل زین الدین علی بن ابراہیم ابن نجا حنبلی قادری، سلطان صلاح الدین کے مشیر اور مقرب تھے اور سلطان صلاح الدین اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے مشورے سے آپ مصر چلے گئے جہاں فاطمین مصر کے اعلیٰ ایوانوں میں اصلاح وتجدید کے پہلو بہ پہلو آپ فاطمین و صلیبین کے گٹھ جوڑ سے سلطان کو آگاہ کرتے رہے اور اسکندریہ کی جنگ میں تو ابن نجا ہی کی معلومات کی بنا پر سلطان اس مہم سے عہدہ برا ہوسکا۔جس نے آگے چل کر فتح مصر کی کلید سلطان کے ہاتھ میں دے دی۔ ابن خلکان اس حوالے سے لکھتا ہے کہ؛

''جب سلطان صلاح الدین نے مصر کا اقتدار سنبھالا تو وہاں مدارس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کیونکہ مصری حکومت کا مذہب امامیہ تھا اور وہ لوگ ایسے اداروں کے قائل نہیں تھے۔ اب سلطان صلاح الدین نے ایک مدرسہ امام شافعی کے جوار میں اور ایک مدرسہ مشہد امام حسینؓ کے جوار میں قائم کیا، اس کے علاوہ متعدد دیگر حنفی، شافعی اور مالکی فقہ کے مدارس اور صوفیہ کی خانقاہ جیسے ادارے تعمیر کیے۔ اس نے جامعہ ازہر کو سنی جامعہ بنا دیا اور اس میں قرآن و حدیث کی تعلیم کی اشاعت شروع کی اور اسے ملک کے تمام حصوں سے مربوط کر دیا۔ ان تمام اداروں میں اساتذہ اور طلبہ کا بندوبست کیا اور ان کے ماہانہ وظائف مقرر کیے۔ ان مصارف کے لیے بڑی تعداد میں اوقاف مختص کیے۔'' (ص:۲۵۸)

مصر میں سلطان نور الدین کی اس فتح کی بازگشت صلیبیوں کے ہاں پورے یورپ میں سنی گئی اور انہوں نے مشرق میں ایک نئے صلیبی حملے کی تیاری شروع کر دی، سلطان نور الدین کے عزائم و ارادے بھی انہی بلندیوں پر تھے، ان کی زندگی کی بس ایک ہی خواہش تھی جس کی تکمیل کے لیے انہوں نے مسجد اقصیٰ کے لیے نیا منبر تیار کرایا لیکن مشیت ایزدی نے اس کام کے لیے اس کے عظیم ساتھی سلطان صلاح الدین کا انتخاب کر چکی تھی۔ ۱۱۷۴ء میں جب سلطان نور الدین زنگی اس بڑی مہم کی تیاریوں میں مصروف تھا، موت نے آلیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اس وقت والی مصر کے طور پر خدمات سرانجام دے رہا تھا، اب تمام مہمات سلطان صلاح الدین کی قیادت میں سرانجام دی جانے لگیں اور اس بڑی مہم کے لیے فضا کے سازگار ہوتے ہی جس کی آرزو میں نور الدین زنگی اپنے خالق سے جا ملا تھا۔ سلطان نے اپنے گھوڑوں کا رخ علماء و فقہاء اور صوفیاء کی معیت میں القدس کی طرف موڑ دیا۔ اس لشکر میں زین الدین ابن نجاء ابن قدامہ، محمد بن قدامہ اور دیگر سربرآوردہ فضلاء و صوفیاء بھی شامل تھے۔

ایک شدید جنگ کے بعد مسلمان اندازِ فاتحانہ بیت المقدس میں داخل ہوئے، ابن نجا حنبلی اس موقع پر آپ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، سلطان صلاح الدین کے عزائم کی رفعتیں اس موقع پر بھی ملاحظہ ہوں کہ سلطان کی نظریں اب وسطی یورپ کی طرف اٹھ رہی تھیں اور اس کے لیے انہوں نے ابتدائی اقدامات کے طور پر ایک وفد مغرب میں موحدین کے سلطان محمد بن تومرت کی طرف روانہ کر دیا تھا، جس کا ایک ہی مقصد تھا جسے ابن شداد نے النوادر السلطانیہ میں نقل کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

''بیت المقدس کی فتح کے بعد سلطان صلاح الدین نے اس سے کہا کہ اس کی آرزو ہے کہ بہترین موت مرے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس سے اس کی کیا مراد ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ بحری سفر اختیار کر کے فرنگیوں کے ملک یورپ میں ان سے جنگ کروں اور اسلام کی اشاعت کروں۔'' (ص:۲۶۵)

الغرض پوری کتاب ان بصیرت افروز تاریخی نکات سے بھری پڑی ہے جس کی روشنی میں امت مسلمہ کے عصری مسائل و مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے چونکہ مباحثِ کتاب امت مسلمہ کے عصری تناظر اور فضا کی طرح سیاسی و عسکری

اور حربی آویزشوں سے بھرے پڑے ہیں لہٰذا دنیا کے مختلف خطوں میں عمل جہاد وقتال میں مصروف طبقات وگروہوں کے ساتھ ساتھ امت کی فکری راہنمائی ودعوت وارشاد پر فائز طبقے اور امت کے عروج واقبال کی خواہش رکھنے والے افراد کے لیے اس کتاب کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔

مبارک باد کے مستحق ہیں اردو سائنس بورڈ کے منتظمین جنہوں نے اردو ترجمے کے ذریعے اردو خواں طبقے کے لیے استفادہ آسان کر دیا۔ فاضل مترجم کی یہ مساعی اپنی قدر و قیمت اور افادیت کی بنیاد پر ''کارنامہ'' کہے جانے کی مستحق ہے، امید ہے کہ قارئین اس کو پذیرائی سے نوازیں گے۔